پچیسواں باب: سورة القيمة (آیات 16 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القیٰمۃ کی آیت 16 سے ہو رہا ہے: (75:16)۔ سابقہ جمعہ کو چونکہ خصوصی درس تھا اس لیے اس سے پہلے جمعہ میں جہاں آیات ختم ہوئی تھیں، ممکن ہے وہ آپ کے ذہن میں نہ ہوں اُن سے اس درس کا آغاز کر رہا ہوں۔ اُن آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ اسے اس کا اعمالنامہ کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی خارج سے لکھی ہوئی نوشت نہیں، دستاویز نہیں، خود انسان کے اپنے نفس کے اوپر منقوش اعمال ہیں۔ سمجھانے کے لیے یہ کہا گیا کہ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے، ظہورِ نتائج کے وقت اس کو کھول دیا جاتا ہے، کوئی دوسرا پڑھنے والا نہیں ہوتا، اسی سے کہا جاتا ہے کہ خود آپ اپنے اعمالنامہ کو پڑھ۔ اور خود ہی اس پر شہادت دے کہ وہ صحیح ہے جو کچھ کہا گیا ہے۔ اسی سے متعلق آیات سابقہ درسِ خصوصی سے پیوست درس میں ہمارے سامنے آئی تھیں۔

نزولِ وحی کے سلسلہ میں موجودہ تفاسیر

عزیزانِ من! اب اگلی چار آیات ایسی ہیں جو میں آپ سے کہا کرتا ہوں کہ بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں تدبر کا خاص موقعہ ہوتا ہے۔ یہ چار ایسی ہی آیات ہیں کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ o اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ o فَاِذَا

قُرْاٰنَهٗ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ [1] (75:16-19)۔ اب ان آیات کے متعلق جو قدیم سے مفہوم چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ جبریل امین وحی لاتے تھے‘ رسول اللہ ﷺ کے سامنے وہ پڑھتے تھے تو آپ ان کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی سے تیزی تیزی سے خود پڑھتے چلے جاتے تھے‘ اس جلدی و تیزی سے پھر کچھ الجھاؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ ادھر جبریل پڑھتے تھے‘ ادھر آپ ﷺ ان کے ساتھ دہراتے تھے اور اس لیے دہراتے تھے کہ کہیں بعد میں کوئی لفظ رہ نہ جائے تو اس پہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ تمہیں جلدی جلدی زبان ہلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ جبریل کہتا ہے اس کو اطمینان سے سنتے جاؤ۔ یہ جو تمہیں خدشہ ہے کہ بعد میں بھول جاؤ گے اور کچھ رہ جائے گا تو سن رکھو کہ نہیں ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم یہ کریں گے کہ آپ کو یہ ساری وحی اسی طرح سے یاد ہو جائے‘ اسی طرح سے پھر آپ اس کو پڑھ لیں۔ یہ مفہوم ان چار آیتوں کا بیان کیا جاتا ہے۔

وحی کے سلسلے میں قابلِ غور نکات برائے تقاضائے ربطِ مضمون

عزیزانِ من! تدبر کے اعتبار سے میرے نقطۂ نگاہ سے میری بصیرتِ قرآنی کی رو سے یہ مفہوم اس لیے قابلِ فہم نہیں کہ اس سے وحی کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ جبریل امین کا اس طرح سے ان الفاظ کا پڑھنا‘ رسول اللہ ﷺ کا سننا‘ پھر اس کا دہرانا‘ قرآن کریم کے تصورِ وحی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن میں تو یہ ہے کہ جبریل وحی کو قلبِ محمدی ﷺ پر نازل کیا کرتے تھے بلکہ وہاں تو ہے کہ ہم وحی القاء کرتے تھے اور نزولِ وحی کی رو سے یہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے یہ کچھ اور حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ وحی کا قلب پہ نازل ہونا ہے اور اس کے

---

[1] آیات 16 تا 19 کو اگر سابقہ آیات کے ساتھ مسلسل لیا جائے تو ان کا مفہوم یہ ہوگا: ''اس قسم کی بہانہ سازی کرنے والے سے کہہ دیا جائے گا کہ قینچی کی طرح زبان چلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو چاہتا ہے کہ اس تیز کلامی سے معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ معاملہ اس طرح ختم نہیں ہو جائے گا۔ یہ کام خود ہم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے کہ انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال کو اکٹھا کیا جائے اور پھر انہیں نہایت حفاظت میں رکھا جائے۔ سو (اے انسان!) جب ہم نے (تیرے اعمال کو) اس طرح جمع و ثبت کر رکھا ہے تو تجھے اس طرح جمع شدہ کے پیچھے پیچھے چلنا ہو گا۔ یعنی جس طرف تمہارے اعمال کے نتائج لے جائیں تمہیں اسی طرف جانا ہوگا۔ اس طرح ہم تمہارے اعمال کے نتائج کو ظاہر کر کے تمہارے سامنے لے آئیں گے۔'' (مفہوم القرآن۔ پرویز)

لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ آیت 16 سے ایک نیا مضمون شروع ہوتا ہے تو ان آیات کا مفہوم حسب ذیل ہوگا:

''اے رسولؐ! تم کسی معاملے کے متعلق عملی قدم اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لو۔ اس وقت تک انتظار کرو جب تک اس معاملہ کے متعلق پورا پورا پروگرام بذریعہ وحی نہ دے دیا جائے (20:114)۔ اگرچہ یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو رہا ہے لیکن تمہیں اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا جمع کرنا اور بحفاظت رکھنا ہمارے ذمے ہے۔ تمہارے ذمے اس کے احکام و قوانین کا اتباع کرنا ہے۔ اتباع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مطالب نہایت وضاحت سے سامنے آ جائیں۔ اس کا ذمہ بھی ہم نے خود ہی لے رکھا ہے۔ ہم ایک مضمون کو مختلف آیات میں بار بار لاتے ہیں اور اس

طرح پوری پوری وضاحت کردیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کو سمجھنے کا طریقہ" (پرویز: مفہوم القرآن، طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، سال اشاعت درج نہیں، ص ص۔ 1388-1389، فٹ نوٹ نمبر 2)

برعکس جبریل امین کا اس طرح سے پڑھ کر سنانا اور اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کا اسے دہراتے چلے جانا کہ کہیں اس میں سے کچھ رہ نہ جائے یعنی کچھ تھوڑا سا یہ خدشہ ہوا کہ کہیں کچھ رہ نہ جائے، قرآن کریم کی تعلیمات کے خلاف ہے کیونکہ یہ خدا کی یقین دہانی ہے کہ نہیں، ایسا نہیں ہوگا آپ ﷺ نہیں بھولیں گے، ہم اسے محفوظ کرا دیں گے۔ تو وہ جو قلبِ محمدی ﷺ پر اس کا القاء کرتا ہے، یہ چیز اس تصور کے خلاف جاتی ہے جس میں وحی کا پڑھ کر سنانا، آپ ﷺ کا سننا، آپ ﷺ کا دہرانا، بتایا جاتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ان تفاسیر کی رو سے اس میں اور پہلی آیات کے معنی میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ جو پہلی آیات ہیں وہ یہی آ رہی ہیں کہ ان میں اعمالنامے کا ذکر ہے، اس کے سامنے اسے پیش کرنے کا تذکرہ ہے اور آخری چیز یہ ہے کہ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ❶ (75:15)۔ اسے کہا جائے گا کہ اب تو کتنی باتیں بنا، تمہاری کچھ پیش نہیں چل سکتی۔ وہ جسے اپنے غلط اعمال کے لیے Justificatory Reason (وجہ جواز) کہتے ہیں وہ تو کتنی ہی بنا اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ تیرے اعمال کیا ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں؟ عزیزانِ من! پیچھے سے یہ بات چلی آ رہی ہے اور ان چار آیتوں (75:16-19) کے بعد پھر آیا ہے کہ کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ❷ (75:20) یہ لوگ اس لیے غلط روش پر چلتے ہیں کیونکہ یہ اس دنیا کی طبعی یا حیوانی سطح کی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو اپنا مقصود حیات قرار دیئے ہوئے ہیں۔ گویا پیچھے سے بھی وہی مضمون آ رہا ہے اور ان آیات کے بعد بھی وہی مضمون ہے جس کا تسلسل ہے۔ تو ربط کا تقاضا یہ ہے کہ یہ درمیان کی آیات کا مفہوم اسی مضمون سے متعلق ہو جو پیچھے چلا آ رہا ہے اور جو اس کے بعد آگے چلایا جا رہا ہے۔ جہاں تک قرآن کے معاملے میں جلدی کرنے کا تعلق ہے ایک اور مقام میں بھی یہی بات کہی گئی ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ وہاں، الفاظ کے دہرانے یا جلدی جلدی پڑھنے یا جبریل امین کے ساتھ وحی کے دہراتے چلے جانے کی بات نہیں ہے۔ وہاں کہا ہے کہ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُهٗ ❸ (20:114)۔

عزیزانِ من! قرآن بتدریج نازل ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ قرآن کا عملی پروگرام دیتے تھے، اس پر عمل پیرا ہوتے تھے، اس کے مطابق عمل کراتے تھے، نظام کی تشکیل کرتے تھے، پروگرام کو آگے بڑھاتے تھے۔ اب یہاں یہ کہا ہے کہ جب تک

---

❶ اس وقت تو اس کی عقلِ بہانہ ساز اس کے غلط اعمال کے جواز میں ہزار دلائل پیش کر دیتی اور اس طرح حقیقت پر پردے ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس وقت اس کے تمام اعمال بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا۔

❷ تم جو حیاتِ اُخروی سے اس طرح بدکتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم صرف مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو۔ تم اس دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات قرار دیئے ہوئے ہو۔

❸ قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کے سلسلہ میں اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب تک (کسی معاملہ کے متعلق) وحی کی رو سے مکمل ہدایات نازل نہ ہو جائیں' اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ (۱۔۲۔۳ مفہوم القرآن۔ پرویز)

قرآن کا پورا موضوع وحی کے ذریعے نہ آ جائے' اس سے پہلے اس پر عمل پیرا ہونے یا اس پروگرام کے بجالانے کے لیے جلدی نہ کرو۔ وہ موضوع پورا ہو جائے تو پھر اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس میں وحی کے الفاظ کو دہرانے کی بات نہیں ہے۔ ان کو عمل میں لانے کا جو طریق تھا وہ بتایا گیا ہے کہ جب ایک موضوع مکمل ہو جائے' پھر اسے عمل میں لائیے۔

ان آیات میں سارا ذکر نامہ اعمال سے متعلق ہے

عزیزانِ من! یہاں جو تفاسیر میں جبریل کے ساتھ وحی کے الفاظ دہرانے کی بات ہے تو میں نے اُس کے بارے میں عرض کیا ہے کہ یہ دو چیزیں ہیں' جن کی وجہ سے کم از کم میری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ وہ مفہوم نہیں ہے جس کی بات پیچھے سے چلی آ رہی ہے۔ مفہوم وہی ہے' اسی سے کہا جا رہا ہے جس کے اعمالنامے کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اسے کہا جا رہا ہے کہ یہ ہے تیرا اعمالنامہ۔ یہ ہم کھول کر تمہارے سامنے رکھتے ہیں۔ اس کو خود پڑھو۔ اس کے بعد دیکھو تم خود اس پر شہادت دو گے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے صحیح ہے۔ اب کہا کہ وَ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (75:15) کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا' باتیں بنانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ وہ ایک متعین چیز ہے جو تمہارے سامنے آئی ہے۔

یہاں میں نے عرض کیا ہے کہ اب یہ جو آیات ہیں آپ انہیں اس تسلسل اور اس ربط کے ماتحت دیکھیں تو ان کا کچھ مفہوم یوں بنے گا: یہ کہا جا رہا ہے کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (75:16)۔ اس میں یہ ہے جیسے ہمارے ہاں محاورے میں کہتے ہیں کہ قینچی کی طرح زبان چلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے' پہلے یہ ہے کہ یہ باتیں بنانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے' اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا' کچھ مفہوم نہیں ہے' کچھ معنی نہیں ہیں' کچھ اثر نہیں ہے' تو نتائج اعمال بدل نہیں سکتا' وہ اس لیے کہ یہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ ہمارے ذمہ تھا کہ ہم اس کو اکٹھا کرتے' اور اس کو محفوظ رکھتے۔ ہم نے اسے محفوظ رکھا ہے اور اب تو تم نے اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہے۔ یعنی جس طرف تمہارا وہ اعمالنامہ لے جائے گا تمہیں اس طرف جانا ہے۔ وہ اگر ایسا ہے کہ وہ جہنمی بنانے کا ہے' تو وہ تمہیں جہنم کے راستے کی طرف لے جائے گا' تم اس کے پیچھے پیچھے جہنم کی طرف جاؤ گے۔ وہ جنت کی طرف لے جانے والا ہوگا تو تم اس کے پیچھے پیچھے جنت میں چلے جاؤ گے۔ اس کی نمود' اس کا ظہور ہمارے ذمہ ہے اور یہ تمہارے اعمال کی نمود کا زمانہ ہے۔ عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ ان آیات کا یہ مفہوم اس ربط کے مطابق ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے اور آگے ہے کہ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (75:20) تم جو حیاتِ اُخروی سے بدکتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم صرف مفادِ عاجلہ پر نگاہ رکھتے ہو۔ تم اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات بنائے ہوئے ہو۔ اب یہاں بات ہوئی ہے کہ یہ کچھ دیکھتے بھالتے اس قسم کی غلط روش کیوں اختیار کرتے ہو۔

حیوانی زندگی کا نظریہ حیات

آپ کو یاد ہے کہ قرآن کی تعلیم کا بار بار نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو حیوانی زندگی ہے؛ اس کے علاوہ ایک اور زندگی بھی دی گئی ہے؛ جسے عام الفاظ میں انسانی زندگی کہیے؛ جسے انسانی ذات کی زندگی کہتے ہیں؛ انسانی Personality (شخصیت؛ ذات) کی زندگی کہتے ہیں۔ اعمال کا اثر اس پر ہوتا ہے۔ وہی ہے کہ جس نے انسان کی طبعی موت کے بعد آگے چلنا ہے؛ ظہورِ نتائج اسی کے لیے ہیں۔ جو لوگ اس نظریہ زندگی یا تصورِ حیات کو نہیں مانتے؛ وہ زندگی کو یہی طبعی زندگی سمجھتے ہیں؛ زندگی کے تقاضے یہی طبعی تقاضے ہیں؛ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ قرآن اسے آخرۃ کے مقابلے میں عاجلہ کہہ کر پکارتا ہے؛ یعنی پیش پا افتادہ؛ سامنے پڑا ہوا مفاد ہے اور وہ آخرت ذرا بعد میں آنے والا مفاد ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کا تصورِ حیات یہ ہے کہ وہ جو طبعی زندگی کے طبعی دنیا کے پیش پا افتادہ مفاد ہیں انہیں جھپٹ کر لیا جائے۔ اس کی پرواہ نہ کی جائے کہ اس کا اثر انسانی ذات پر کیا پڑتا ہے۔ جس طریقے سے بھی روپیہ یا دولت ہاتھ آتی ہے اکٹھی کر لی جائے؛ اس کا انجام کیا ہوگا؛ اس کی پرواہ نہیں۔ وہ یہ کرتے ہیں۔ یہ نظریہ زندگی ہے جس کی رو سے یہ لوگ جائز و ناجائز میں؛ غلط اور صحیح میں؛ حق اور باطل میں؛ تمیز نہیں کرتے۔ جو چیز جس طریق سے حاصل ہوتی ہے؛ اسے یہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے اعمالنامہ کے جو غلط اعمال کے اندراجات ہیں وہ انہیں جہنم کی طرف لیے چلے جا رہے ہیں؛ اسی لیے قرآن میں آیا ہے کہ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ o وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ [1] (75:20-21)۔ یہاں قرآن عاجلہ کے مقابلے میں اٰخرۃ لایا ہے۔ وہ خیال نہیں کرتے کہ ان کی جتنی غلط روشیں ہیں آخرت؛ عاقبت؛ انجام کار؛ مآل کار؛ مستقبل میں؛ ان کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ٹھیک ہے؛ دنیاوی مفادِ عاجلہ بڑی جلدی حاصل ہو جاتے ہیں؛ محسوس ہوتے ہیں؛ نظر آ جاتے ہیں؛ ان کی کشش ہوتی ہے مگر ان کے نتائج اس وقت غیر محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ذرا گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہے جسے قرآن اٰخرۃ کہتا ہے اور وہ ہے جسے قرآن عاجلۃ کہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دو تصورِ حیات؛ دو نظریاتِ زندگی ہیں۔ [2] اس لحاظ سے آپ انہیں دو قسم کے لوگ کہہ لیجیے۔ جنہوں نے مستقبل کی خوشگواریوں کو اس دنیا کی زندگی میں؛ اپنے سامنے رکھا ہوگا تو جب ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ یہ ظہورِ نتائج کا وقت؛ مرنے کے بعد؛ قیامت ہی میں؛ جا کر نہیں آتا۔ وہ قیامت تو برحق ہے لیکن اس کا سلسلہ یہاں اسی دنیا سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جنت اور جہنم یہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں۔

---

[1] تم اسی دنیا کی طبعی یا حیوانی زندگی کے مفاد حاصل کرنے کو مقصودِ حیات قرار دیے ہوئے ہو اور مستقبل کی زندگی کا تمہیں کوئی خیال نہیں۔ (مفہوم القرآن ۔ پرویز)

❷ (۱) میکانکی تصورِ حیات اور (۲) قرآنی تصورِ حیات۔

اُخروی زندگی کے لیے مفادِ عاجلہ کی قربانی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ جن کے سامنے آخرت کا بھی تصور تھا' انہوں نے عاجلہ مفاد کو بعض اوقات خوشگوار مستقبل بنانے کے لیے' قربان کر دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ زندگی بہر حال آگے چلنے والی ہے' اس کا خیال کرنا چاہیے۔ ظہورِ نتائج کے وقت اعمال کے نتائج ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ [1] (75:22-23)۔ اس آیت میں پہلا ناضرۃ ''ض'' کے ساتھ ہے اور دوسرا ناظرۃ ''ظ'' کے ساتھ ہے۔ یہ عربی زبان ہے۔ کہا کہ اس دن یہ لوگ' جنہوں نے مستقبل پر نگاہ رکھی ہوگی' ان کے چہرے بڑے ہشاش بشاش ہوں گے۔

خدا تعالیٰ کے دیدار کا مفہوم

عزیزانِ من! اب اگلی آیت میں یہ چیز ہے کہ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ [2] (75:23) وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قیامت میں خدا کا دیدار ہوگا' وہ سامنے آئے گا اور اس طرح لوگ اسے دیکھیں گے۔ میں اس فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ خدا کا جو تصور قرآن نے دیا ہے' وہ بہر حال محسوس آنکھوں سے دیکھا جانے والا نہیں ہے۔ عام آنکھیں تو ایک طرف رہیں' وہ تو پیغمبر کی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ حضرتِ موسیٰ ◆ نے بھی جب یہ کہا تھا کہ بات تو آپ سنا رہے ہیں' ذرا بے نقاب سامنے بھی تو آیئے' تو جواب دیا گیا کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (7:143) تو مجھے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ محسوسات سے بلند' وراء الورات ہے: برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔ وہ تو اس نے جو اپنی صفات بیان کر دی ہیں' ان سے ذہن میں کچھ ایک تصور قائم ہو سکتا ہے' محسوسات کی دنیا کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے۔ بہر حال یہ اگر محسوس معنوں میں لیا جائے کہ وہاں یہ چیز محسوس طور پر سامنے ہوگی تو وہ قرآن کے اس تصور کے خلاف چلی جاتی ہے۔

قرآن نے اُخروی زندگی کو مثالی طور پر بیان کیا ہے

عزیزانِ من! وہاں حیات بعد الموت کی زندگی کیسی ہوگی' اسے ابھی ہم نہیں جان سکتے۔ وہ تو خود ہی قرآن نے مثالی طور پر بیان کی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اگر وہاں قرآن نے باغ کہا ہے تو اس میں اسی قسم کے درخت لگے ہوئے ہوں گے' وہ باغ ہوگا اور اس کے نیچے اگر نہریں جاری ہیں' تو واقعی وہ ندی ہوگی' اسی طرح کے پانی ہوں گے اور یہ سب چیزیں ہوں گی۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے سمجھانے کے

---

❶ مستقبل کی خوشگواریاں' مفادِ عاجلہ کے مقابلے میں بہت زیادہ شگفتہ و شاداب ہیں۔ جن لوگوں کو وہ حاصل ہوں گی ان کے چہرے ہشاش بشاش اور تر و تازہ ہوں گے۔ اور وہ اپنے نشوونما دینے والے کی فیض گستری اور کرم فرمائی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ وہ اپنے نشوونما دینے والے کی فیض گستری اور کرم فرمائی کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔ (ایضاً)

لیے مثالی طور پر یہ کچھ کہا ہے۔ یہ تو دراصل خدا کی کرم گستری' اس کی عنایات' اس کی نوازشات ہوں گی۔ رب سے ربوبیت ہی کیوں نہ مراد لی جائے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر ہے کہ انہیں اس کے سامانِ ربوبیت کی فراوانیاں حاصل ہونگی اور اس سے ان کی زندگی بڑی خوشگوار ہوگی' چہرے بڑے مسکراہٹ سے بھرے ہوئے ہونگے۔ اور ان کے برعکس وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ o تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ❶ (75:24-25) جو دوسرے قسم کے لوگ ہونگے ان کے چہرے بڑے افسردہ' پژمردہ' جسے منہ "بسورے" ہوئے کہتے ہیں' ہوں گے۔ یہ "باسرۃ" اسی "بسورے" سے ہی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہوگی اس لیے کہ انہیں نظر آ رہا ہوگا کہ کمر توڑ دینے والی ایک مصیبت ہے جو ان پر آن پڑے گی۔ وہ جو ان کی غلط روش کا انجام ہوگا اس وقت وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے گا۔ یہاں تو یہی صورت ہے کہ انسان اپنی غلط روش کے انجام کو محسوس طور پر اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتا' یا اسے دیکھتا نہیں ہے۔ اس وقت وہ سامنے آ جائے گی اور اسے نظر آئے گا کہ ہاں یہ ایک "فاقرۃ" ہے جو بہت بڑی' جسے کمر شکن کہتے ہیں' کمر توڑ دینے والی' ایک مصیبت ہے جو آنے والی ہے۔

یہاں کہا ہے کہ انہیں مستقبل کی زندگی کے متعلق ہرگز شک وشبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور وہ لفظ ہے: كَلَّآ (75:26)۔ اب یہ کہتا ہے کہ یہ آخرت کی زندگی کا' مرنے کے بعد کی زندگی کا' انکار کیے چلے جاتے ہیں حالانکہ انسان کی مرنے کے بعد کی زندگی کی کیفیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ o وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ o وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ o وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ❷ (75:26-29)

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ آخری دو تین پاروں کی یہ جو اس قسم کی آخری سورتیں ہیں' ان کی آیات بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ دو دو لفظ کی آیات ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ بالکل عروج پہ پہنچی ہوئی ہیں۔ جامعیت اور Concentration (ارتکاز) کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک لفظ کے اندر معنی کی دنیا چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب یہ کس انداز سے دیکھتے ہیں؟ ایسا نظر آتا ہے جیسے کچھ شاعری کی بات ہو رہی ہے۔

قرآنِ حکیم نے بتایا ہے کہ اسی زندگی میں جب تم آخری لمحات کی ہچکیاں لے رہے ہوتے ہو' جس وقت موت سامنے نظر آ رہی

---

❶ جن لوگوں کو یہ کچھ میسر نہ ہوگا ان کے چہرے افسردہ و پژمردہ ہوں گے' اس لیے کہ انہیں یہ دھڑکا لگا ہوگا کہ اب وہ مصیبت آنے والی ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت انسان سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتا ہے اور سانس گلے میں اٹک جاتی ہے اور ہر کہنے والا یہی کہتا ہے کہ اس وقت جو کچھ بھی بن پڑے کر لینا چاہیے (اگر دوا دارو سے فائدہ نہیں ہوتا تو) کسی جھاڑ پھونک والے کو بلاؤ' شاید وہی اس کی جان بچا لے۔ اس سے مرنے والا سمجھ لیتا ہے کہ اب اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اس وقت اس کی اور اس کے پسماندگان کی سختیاں اور مصیبتیں تو برلو جمع ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ (ایک پر دوسری

مصیبت چلی آتی ہے۔)(مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوتی ہے' اس وقت تمہاری اور تیمارداروں کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کوئی علاج معالجہ تو ایک طرف رہا' وہ توہمات سے بھی نہیں چوکتے۔ وہ کہتے ہیں او! کوئی بات نہیں' اگر کسی دوائی سے فائدہ نہیں ہوتا' کسی جھاڑ پھونک والے کو ہی بلالو' کچھ دم درود ہی کرالو' کسی پیر صاحب کو ہی آواز دیدو۔ یعنی اس وقت تمہاری مایوسی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ یہ جو ساری دنیائے اسباب میں تم ہر چیز اسباب کی رو سے' سامان کی رو سے' محسوسات کی رو سے' کرتے تھے اس وقت تم توہمات کی دنیا میں چلے جاتے ہو کہ کسی طرح سے یہ بچ جائے' اس کی مصیبت' تکلیف کم ہوجائے۔ وہاں تک تم پہنچ جاتے ہو۔ یہ جو اس وقت تم اس طرح سے انکار پہ انکار کیے چلے جاتے ہو' اس وقت تمہاری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ تم بوکھلائے ہوتے ہو' تمہاری پریشانی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ تم یہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہو اور یہ ہمارا ایسے وقت میں روزمرہ ایسا تجربہ ہے کہ جب کیفیت یہ ہوجائے کہ وہ طبیب بھی مریض سے مایوس ہوکر اٹھ کے چلا جا رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ "یوں تو خدائی خدائی برحق ہے' پر ہمیں تو کوئی آس نظر نہیں آتی" تو پھر اس وقت یہ کیفیت ہوتی ہے: کوئی کہتا ہے کہ صاحب وہاں ایک بھنگڑ خانے کا چوڑا ❶ ہے۔ وہ ڈھول بجاتا ہے تو اس سے یہ فائدہ ہوجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ او! اونوں ای سدلے۔ ❷ یعنی قرآن کا یہ بات کہنے کا کیا انداز ہے کہ اس وقت عقل اور فکر اور منطق اور فلسفہ اور محسوسات اور دوا دارو سب چیزیں تم چھوڑ جاتے ہو اور یہاں تک پہنچ جاتے ہو کہ عام زندگی میں جن چیزوں کا تم مذاق اڑاؤ' اس وقت ان چیزوں کے متعلق بھی کہتے ہو کہ او! یہ بھی کرکے دیکھ لو شاید یہی کچھ ہوجائے۔ تمہاری مایوسیوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اور اُدھر شدت سے تکلیف پر تکلیف جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! ساق کا یہ لفظ عربی زبان میں ہے۔ یوں تو اس کے معنی پنڈلی کے ہوتے ہیں لیکن محاورہ عربی زبان میں ہے کہ جب کوئی شدت کی تکلیف آئے تو اس کے لیے یہ لفظ کہتے ہیں۔ پنڈلی کھل جانا' اردو میں بھی ایک محاورہ ہے' اگرچہ اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ تکلیف پہ تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اِلٰی رَبِّکَ یَوۡمَئِذِ الۡمَسَاقُ ❸ (75:30)۔ عزیزانِ من! یہاں "مساق" کا لفظ آیا ہے یعنی یوں ہے کہ جیسے اس وقت پھر کوئی ہنکائے جا رہا ہو' جیسے کسی بیل کو' کسی مویشی کو پیچھے سے ہانکتا ہوا چلا جا رہا ہو' کھینچ کے کسی طرف وہ لے جا رہا ہو مگر وہ جانہ رہا ہو اور یہ لے جا رہا ہو۔ یعنی یہ عجیب انداز کی بات ایک ہی لفظ میں کہہ دی کہ پھر اس وقت یہ بارگاہِ خداوندی کی طرف ہنکائے جا رہا ہوتا ہے۔ یہ وہ چیز تھی جسے یوں کہتے ہیں کہ وہ کیا بات تھی جو اس کی یہ کیفیت ہوگئی؟ اب دو آیات میں آپ غور کیجیے کہ کیا کچھ کیسے کہہ دیا گیا ہے۔

---

❶ بھنگی

❷ اُسے ہی بلالو۔

❸ اُس وقت انسان کو ہر طرف سے ہٹا سمٹا کر عدالت خداوندی کی طرف ہانک کر لایا جاتا ہے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

عزیزانِ من! ادب میں ایک صنف ہوتی ہے اسے نشر ❶ کہتے ہیں: ادھر کے ایک لفظ کے مقابل میں سامنے دوسرا لفظ لانا۔عام طور پر یہ شاعری میں ہوتا ہے۔عربی زبان کے ادب میں بھی یہ بڑی خصوصیت ہے کیونکہ اس میں تو پوچھیے ہی نہیں کہ کتنے الفاظ ہوتے ہیں مرادفات تو سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ان کے ہاں یہ نشر بڑا لطیف ہوتا تھا۔

صدّق کے بالمقابل کذّب اور صلّٰی کے بالمقابل تولّٰی کا مفہوم

قرآن کی اس آیت کے اندر یہ صنف نشر نظر آرہی ہے: فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ❷ (75:31)۔اس کی یہ حالت ایسی کیوں ہوئی اس لیے کہ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ٥ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ❸ (75:31-32) یہاں "صدق" کے مقابل میں "کذب" آیا ہے۔اس لیے کہ یہ حقائق کی تصدیق نہیں کرتا تھا۔یہی ایک بات نہیں ہے کہ کچھ نہ کرے خاموش رہے۔آگے دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ "کذّب" آگیا۔"صدق" کے مقابل میں "کذّب" آگیا۔تصدیق نہیں کرتا تھا' حقائق کی تکذیب کرتا تھا۔اب یہ دیکھیں کہ یہ دونوں چیزیں ملانے سے مطلب بالکل واضح ہوجاتا ہے۔یہ چیزیں ایک دوسرے کی Opp osit (متضاد) ہوتی ہیں' مخالف ہوتی ہیں جیسے ایک طرف فلا صدق اور دوسری طرف ولکن کذّب آیا ہے یعنی تصدیق نہیں کرتا تھا' تکذیب کرتا تھا۔دوسرا ہے: ولا صلی اور و تولی۔اب "صلی" کے مخالف "تولی" آیا ہے۔"تولی" کا تو مفہوم متعین ہے کہ ہر جگہ منہ موڑ کے چل دینا' گریز کی راہیں نکال لینا' پیٹھ پھیر کے چل دینا۔اب اس کے مقابلے میں "صلّٰی" ہے۔اب اس کے لیے ہمارے ہاں جو عام ترجمہ کیا جاتا ہے وہ ہے کہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ٹھیک ہے صلوٰۃ بڑی اہم چیز ہے لیکن وہ تو میں اس آیت میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو قرآن کا ادبی اعجاز ہے یہ بات اس کے خلاف چلی جاتی ہے کہ یہ ادھر "صلّٰی" کہتا ہے اور اس کے مقابل "تولّٰی" کہتا ہے۔"تولی" کے مقابل کا

---

❶ اصلاح میں اسے "لف ونشر" بھی کہتے ہیں۔لف کے معنی ہیں لپیٹنا اور نشر کے معنی ہیں پھیلانا۔اصطلاح میں کلام کے اندر دو یا زیادہ باتوں کا ذکر کر کے ان سے تعلق اور مناسبت رکھنے والی اتنی ہی باتوں کا مزید ذکر کرنا "لف ونشر" کہلاتا ہے۔اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) لف ونشر مرتب۔(۲) لف ونشر غیر مرتب اور (۳) لف ونشر معکوس الترتیب۔اس آخری صورت کی مثالیں یہ ہیں

ایک سب آگ' ایک سب پانی ..... دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں (میر)

اس میں "آگ" اور "پانی" اس کی مثال ہیں۔

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے (اقبال)

اس میں "ابتدا" اور "انتہا" اس کی مثال ہے۔

❷ (ان حقائق کی روشنی میں' تم اس شخص سے کہو) جو ہمارے قانون مکافات کی تصدیق نہیں کرتا' اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا۔

❸ ہمارے قانون مکافات کی تصدیق نہیں کرتا اور سیدھے راستے پر نہیں چلتا بلکہ اس کی تکذیب کرتا ہے اور اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ (۲۔۳

مفہوم القرآن - پرویز)

لفظ آنا چاہیے‘ اس کی ضد کا لفظ آنا چاہیے۔ عربی زبان میں یہ جو مادہ ❶ ہے‘ جسے ہم صلوۃ کہتے ہیں‘ اس کے معنی ہیں: کسی کے پیچھے پیچھے سیدھے راستے پہ چلے جانا۔ بنیادی معنی اس کے یہ ہیں۔ اسے پھر دہرا دوں‘ جو کئی دفعہ دہرایا گیا ہے کہ جسے مصلی کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ریس کورس میں ایک گھوڑا پہلے نمبر پہ جا رہا ہو‘ اس کے پیچھے دوسرا گھوڑا اس انداز سے اس کے پیچھے پیچھے جائے کہ اس کی کنوتیاں اس کی پشت کے ساتھ چھوتی ہوئی ہوں یعنی دونوں کے درمیان میں کوئی فاصلہ نہ ہو لیکن جائے یہ اس کے پیچھے اور مسلسل اس کے پیچھے جائے۔ اسے عربی میں مصلی کہتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں تو مصلی کا ترجمہ نماز پڑھنے والا ہوتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس لفظ کی بنیاد میں چلے جائیے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! قرآن کا مفہوم سمجھنے کا طریقہ بار بار دہرا دوں۔ وہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ کے مادے کے بنیادی معنوں کی طرف جائیے‘ پھر یہ دیکھیے کہ عرب ان الفاظ کو کن کن معنی میں استعمال کرتے تھے‘ پھر دیکھیے کہ قرآن میں ان میں سے کونسا لفظ اس آیت کے اندر صحیح بیٹھتا ہے۔ یہ آپ کریں گے تو سارا قرآن سمجھ میں آ جائے گا‘ کوئی دشواری نہیں ہوگی‘ کہیں تضاد نہیں ہوگا‘ کہیں تخالف نہیں ہوگا‘ کہیں ابہام نہیں ہوگا۔ اور اگر آپ یہ کچھ نہیں کریں گے تو ایک ایک آیت میں آپ کو ابہام نظر آئے گا۔ اب یہاں ہی وہ جو ادب کی اتنی بڑی صنف ❷ ہے‘ اسے ہی دیکھ لیجیے۔ مثال کے طور پر ہم "صَدَّقَ" کے مقابلے میں تو "کَذَّبَ" کا لفظ صحیح معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن "تَوَلّٰی" کے مقابلے میں جو "صَلّٰی" ہے کہ یہ حقائقِ خداوندی کی تصدیق نہیں کرتا تھا‘ ان کی تکذیب کرتا تھا‘ ادھر اُدھر منہ موڑ کے چل دیتا تھا‘ گریز کی راہیں نکالتا تھا تو پھر اس کے پیچھے کوئی ایسا لفظ آنا چاہیے جو اس کی ضد ہے‘ وہ تیسرا لفظ "مصلی" ہے کہ یہ سیدھے سیدھے راستے پہ صراطِ مستقیم پہ نہیں چلتا تھا‘ گریز کی راہیں نکال کر ادھر اُدھر مڑ جاتا تھا‘ تو بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ کچھ یہ کرتا تھا۔

یہ تکذیب کرنے والے کون ہیں؟ آپ کو پتہ ہے کہ "تکذیب" اور "تکفیر" میں فرق کیا ہے؟ کفر تو یہ ہے کہ آؤٹ رائیٹ (Out right بالکل ہی) کسی چیز سے انکار کر دینا جیسے کہ میں مانتا ہی نہیں ہوں اور تکذیب یہ ہے کہ زبان سے کہتے رہنا کہ مانتا ہوں‘ کہتے چلے جانا کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ‘ کائنات میں‘ دنیا میں‘ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں سوائے خدا کے۔ یہ کہتے چلے جانا ہے اور ہر دوسرے شخص کو خدا بناتے چلے جانا‘ زبان سے یہ کہتے چلے جانا عملاً یہ کرتے چلے جانا۔ اسے تکذیب کہتے ہیں۔ تصدیق یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

---

❶ صلوۃ کا مادہ "ص ل و" ہے۔

❷ درسِ فکر

تکذیب کا قرآنی مفہوم اور اس کے مضمرات

عزیزانِ من! یہ تباہی نہیں ہے کہ ہم صدقِ دل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھتے ہیں پھر جتنا پڑھتے ہیں مرزا! چشمِ دل کے ساتھ یہ تو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھتے ہیں۔ یہ عملی طور پر ثابت کرتا ہے۔ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں اس معاملے کا میں گواہ ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی شخص صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ اللہ اکبر! یہ تقی بڑی گواہی ہے۔ لیکن کیا یہ ہو رہا ہے؟ کیا یہ سچ ہو رہا ہے؟ کیا یہ اس صدق کی تکذیب نہیں کر رہا؟ یہ ظہر سے ظہر سے پیچھے اتر کر پوری زندگی میں ہم میں سے ہر ایک اس کی تکذیب نہیں کر رہا۔ کیا نہیں کرتا؟ یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہے کہ کچھ نہیں۔ جب کوئی وعدہ ہے اس کا یہ کہتا نہیں ہے۔ وعدہ انکار کرتا ہے۔ وہ بھی یہ بات کہتا اور اس طرح بیکار والا انکار کرتا ہے۔ وہ بھی اس بات کو نہیں مانتا۔ لیکن ہم سب یہ غلط ہے سے جب جا رہے ہیں اور عملاً انکار کیے جب جا رہے ہیں۔ اس طرح تکذیب کرتے ہیں۔ صدق کے مقابلے میں تکذیب آیا ہے۔ دوسری اگلی بات یہ ہے کہ وہ سیدھا اس راستے پر نہیں چلا بلکہ گریز کی راہیں نکالتا چلا جاتا ہے۔ سوار ہو رہا ہے۔ حقیقی دولت کی چاہت جمع کرلو قرآن میں آیا ہے کہ یہ جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے۔ میں اس کے بارے میں یہ سوار کچھ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں سے حق سے پیچھے خیرات کر بیٹھے باقی سب مال پر ہے۔ یہ دین راہیں ہیں کہ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (القیامۃ 75:33) پھر وہ اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے۔ قرآن میں ایک اہم جگہ ہے جب اس سے کہا جاتا ہے کہ ہو! یہاں تو تم نے عیش و آرام کا اہتمام کر دیا ہے آخرت میں بھی سوچ رکھا ہو گا؟ قرآن کہتا ہے وہ اس سے کہے گا کوئی بات نہیں ہے میں نے وہاں کا بھی اہتمام کر رکھا ہے۔ کیسے! کیا کر رکھا ہے؟ کہتا ہے کہ کچھ مال ہمیں یہاں سے بھی زیادہ بہتر مقام ملے گا کیونکہ جو شخص یہاں ایک محل بنا لے اس کا موتیوں کا گھر وہاں بن جائے گا۔ تیس جس طرح کی چاہے دولت جمع کر لو اس میں سے کچھ حصہ ڈال دیجئے تو اب یہ مال (Secure) محفوظ ہو گئے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ تو اس کے یہ مال کے تحفظات ہیں۔ یہاں یہ جو یَتَمَطّٰى (القیامۃ 75:33) آیا ہے کہ وہ اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف آتا ہے یعنی اسے شرم نہیں آتی ندامت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اس بات پر فخر کرتا ہے۔ یہ بات ہے صاحب! اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ❶ (القیامۃ 75:34-35) عزیزانِ من! قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف آتا ہے مگر سمجھتا نہیں ہے کہ اس کے لیے تباہی ہے۔ یہ سراسر تباہی بالکل تباہی۔ اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ اَيَحْسَبُ

---

❶ اے بدنصیب! تیرے لیے اس قدر بہتر تھا کہ تو میں خدا اور دین کا تابع رہتا۔ اے کاش! یہ بات تیری سمجھ میں آ جاتی کہ وہ روش تیرے حق میں کس

قدرِ مفید نمبر　(مفہوم القرآن پرویز)

الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ❶ (75:36) - اس آیت میں "سدیٰ" کا لفظ عجیب لفظ ہے۔ کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔ عرب "سدیٰ" لفظ کے عام طور پر ایسی معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسے ہم شتر بے مہار کہتے ہیں یعنی جس سے کوئی مواخذہ ہی نہ کیا جاتا جس پر کوئی گرفت ہی نہ کی جاتی جس کو یونہی آوارہ چھوڑ دیا جاتا۔

اس پوری کائنات کا اور انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے

قرآن کی رو سے کائنات کا اور بالخصوص انسانی زندگی کا ایک مقصد ہے۔ کائنات کا کیا مقصد ہے؟ وہ تو ہم نہیں جانتے مگر انسانی زندگی بلامقصد پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اقبال (1877ء، 1938ء) نے بالکل صحیح کہا تھا کہ یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود۔ ❷ عزیزانِ من! انسانی زندگی کا ایک Purpose (مقصد) ہے، لائف (زندگی) کا ایک متعین نصب العین ہے۔ جو چیز کسی مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہو وہ عبث نہیں ہوتی۔

اب عبث کا لفظ آیا ہے تو دیکھیے قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ کہا ہے کہ **أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا** (23:115) کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے تم بلامقصد پیدا کیے گئے ہو۔ تمہارا کوئی نصب العین نہیں ہے کوئی منزل نہیں ہے کوئی منتہیٰ نہیں ہے۔ اور ان سے جدھر جی چاہے منہ اٹھا کے چل دو کوئی ایسی قوت نہیں ہے جو تمہیں اس نصب العین حیات کی طرف پھیر کے لے جائے۔ کیا تمہیں بلامقصد پیدا کیا؟ یہاں عبث کا لفظ ہے وہ کہا ہے کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت اور بلامقصد پیدا کر دیا ہے۔ کھاتے پیتے رہو گے۔ کچھ دن زندہ رہے پھر خاک میں مل گئے۔ اور زندگی کا ماحصل تم نے کیا؟ اس سے جو کچھ تمہارا جی چاہے تم کرتے رہو۔ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔

عزیزانِ من! وہ مقصد تو ہے ہی نہیں یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم سمجھ رہے ہو کہ کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی مواخذہ کرنے والا نہیں۔ **وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ** (23:115) اور تم پر ہمارے قانونِ مکافات کی کوئی گرفت ہی نہیں؟ تم سمجھ بیٹھے ہو کہ خدا کے ہاں کوئی

❶ انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے غور طلب کوئی منزل متعین، نہ اس راستے پر چلنے کے قواعد و ضوابط۔ اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے اور جس طرف جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ اس تصورِ حیات کا نتیجہ ہے کہ وہ طبیعی زندگی کی معاد پر حیوان کا تابع رہتا ہے اور اس میں انسانی ذات Human Personality کا پتا نہیں۔ اسی طرح اس کی ساری زندگی بے مقصد دوڑ دھوپ میں ضائع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ زندگی معاد حاصلہ کے تانے اور مستقبل کے بانے سے بنے چیز کا نام ہے۔ یہ یوں نہیں کہ زندگی عبارت ہے پیدا کرنے میں ... مستقل اقدار اور ... اس طرح صحیح طور پر انسانی زندگی کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآنی تعلیم کی واضح صراحت ہے اور یوں انسانی کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیا ہے۔ (مفہوم القرآن پرویز)

❷ اقبال: جاوید کے نام، ادارہ ... پبلی کیشنز لاہور 1996ء، ص 129۔

یہ بات کہ آدم پیدا ہو مقصود	ہر رگ و ریشہ ہو ہر رگ و ریشہ

موجود نہیں ہے جو کچھ نہیں آتے اور آتے جاتے ہیں زندگی میں پیش آتا ہے۔ پہلی چیز تو اس میں یہ دی گئی ہے کہ موجود ہوگا تو پھر اس طرح سے لاپرواہی نہیں ہو سکتے گا۔ یہ تمہیں یقین نہیں ہے تصدیق نہیں ہے؟ زبان سے کہتے ہو تم اس کی تصدیق نہیں کرتے ہو۔

عربوں کی زبان میں لفظ ''ہدیٰ'' کا مفہوم

گویا لفظ جو عرب استعمال کرتے تھے وہ ''ہدیٰ'' ہے۔ یہ لفظ تو بہت عظیم فلسفہ رکھتا ہے۔ حیث بڑا مقصد! یہ کیا چیز ہے؟ یہ عجیب چیز ہے جو میں بیان کرتا ہوں کہ یہ عرب کی بڑی قوم تھی۔ مکے جیسا اس کا نام القریٰ Capital City مرکز تھا۔ یہ سب کچھ یہ تجارت کا یہ قافلوں کے آنے جانے والوں کا راستہ تھا اور مکے جیسے شہر میں صرف سترہ آدمی وہ تھے جو صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ تعلیم تو بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ یہ صرف معمولی پڑھنا تھا۔ اس دور میں جو یہ بڑا جاتا تھا۔ یعنی یہ پورے کا پورا ملک بہت تاریک تھا۔ اس میں یہ قوم تھی۔ یہ اس قوم کی اس زمانے کی زبان ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے یہ بڑے بڑے معنی کہاں سے نکالے ان کے ذہن کے اندر یہ معنی کہاں سے آئے۔ جو بہت ہی بڑے کام کا ہے وہ ''ہدیٰ'' ہے۔ یہ بات باعث تعجب ہے۔ میں نے عرض کیا ہے وہ ان کے ہاں کے یہ جو الفاظ ہیں اور ان الفاظ کے یہ جو مادے (Roots) ہیں یہ عرب ان مادوں کو جس طرح استعمال کرتے تھے اگر وہ چیز یں آپ کے سامنے آ جائیں تو قرآن کے معنی نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

وہ ''ہدیٰ'' کو کیسے استعمال کرتے تھے؟ بات تو یہ ہے۔ عرب اس لفظ کو استعمال کرتے تھے کہ کوئی ایسا کام ہو جو نتیجہ خیز نہ ہو کوئی نتیجہ پیدا نہ کرے اس میں تو کوئی لگ رہے۔ مگر یہ الفاظ آپ دراصل شعر کے حوالے سے دیکھے کہ تنگ و دو بھاگ دوڑ کی جا رہی ہے سب ہو مگر اس کا نتیجہ کوئی نہ ہو تو وہ اسے کیسے سمجھتے تھے؟ ہم نے تو یہ سب شہر میں اور شہر والوں نے مولانا بہت کم دیکھا ہوگا وہ یہ تانا بنتا ہے۔ اس کے ہاں ایک تانا ہوتا ہے۔ دو کھونٹے گاڑ لیے جاتے ہیں وہ تانا ہوتا ہے اور ایک بانا ہوتا ہے۔ جو تانے کی طرح سے اس تانے سے گزار کر لے جاتے ہیں۔ یہ دونوں تانا اور بانا کہلاتے ہیں۔ یہ تانا اور بانا بیٹھے ہوں تو پھر یہ ''ثوب''[1] بنتا ہے یعنی کپڑا بنتا ہے پھر وہ ''ثوب'' ہوتا ہے۔ اگر تانا ہی تانا ہے مولانا ساری عمر لگا رہے وہ تانا ہی تانا تنتا چلا جائے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ یہ حبط عملہم[2] ہے۔ تگ و دو تو ہو رہی ہے کوشش ہو رہی ہے محنت ہو رہی ہے ساری عمر بھی لگا رہے تو بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور اگر کوئی دوسری طرف بانا ہی بانا ہی بنتا رہے پھر بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ بلکہ اگر زندگی ہو تو انسانی زندگی ہو صرف دنیا کی زندگی ہو اس کے اندر القدر یعنی ہدیٰ کا بانا نہ ہو تو وہ تانا ہی تانا رہے گا۔ نہ آخرت کی زندگی ہو آپ کے ہاں کی یہ شرعی رسومات کی اور شعری زندگی ہو یہ بانا ہی بانا ہوگا اس میں

[1] کپڑا

❷ ان کے اعمال بیکار گئے

تا نا نہیں ہے۔ دھر بانا نہیں ہے تانا ہے۔ دھر بانا ہے تانا نہیں۔ یہ ساری عمر بانے میں گزر جاتی ہے اور تانے میں گزرتی ہے تو حبطت اعمالھم ❶ ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بیکار ہو گیا۔ ایک لفظ "سدن" نے یہ سب بھلا دیا۔ زندگی ان دونوں (تانا اور بانا) کے امتزاج کا نام ہے۔ یہ بات مفکر قرآن اقبال 1877-1938 نے کہی۔

جب ہو ایک بات سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ شخص بھی بیکار ہو جاتا ہے۔

خانقاہیت بھی تانا ہی تانا ہے

ایک مذہب نہیں ہے۔ مذہب تو محض تانا ہی تانا ہوتا ہے۔ یہ خانقاہیت بھی تانا ہی تانا ہے۔ یہ جسے روحانیت کہتے ہیں یہ فریب نفس ہے۔ یہ Mechanically (میکانکی طور پر) مذہب کے جتنے بھی شعائر ادا کرتی ہے زندگی طور پر Mechanically قرض ادا کرنے والی بات ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ بھی تانا ہی تانا ہے۔ دوسری طرف زندگی کا مقصود صرف اس طبعی زندگی کے اسباب و سامان کو حاصل کرتے چلا جانا اور اس میں قدم پھلا دینا ہو تو نہ لانا بانا ہی بانا ہے جس میں اس قدر رہ کر تانا نہیں ہے جبکہ زندگی ان دونوں کے امتزاج کا نام ہے۔ ایک مادیت کا امتزاج نہ ہو اور شرف کا امتزاج نہ ہو تو بس روحانی کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ وہ تو پھر کی تانے کی طرف لے جاتا ہے۔ انسان کے لیے تو میں اقدار کہہ رہا ہوں۔ وہ صحیح لفظ ہے۔ اس کی (Values) اقدار کا ساتھ ہوں چونکہ یہ دونوں ہیں یہ شرف کی جانب تو پھر ایک بنتا ہے جس کا تانا اور بانا صحیح ہو جائے۔ اس قوم کی بیکار ہے۔ اس تانے اور بانے کے ملنے سے انہوں نے ثوب کا لفظ استعمال کیا کہ یہ الثوب بنتا ہے اور اس "ثوب" سے کہا گیا۔ جب یہ جاتے تو کام کا "ثوب" ہوتا ہے۔ نہ ہو جائے تو پھر ثوب نہیں ہوتا۔ کسی کے پاس تانا ہوتا ہے کسی کے پاس بانا ہوتا ہے۔ دونوں فریب میں رہتا ہو تے ہیں اور کام کر رہے ہیں۔

جو ہی تانا تندی پھر دی ہے

عزیزان من! آپ نے غور فرمایا ہے ہمارے ہاں یہ جو کھڈی پر تانا اور بانا ہوتا ہے اس سے پہلی ایک منزل ہوتی ہے۔ یہ سوت کی تانی کے حوالے سے ہوتا ہے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں وہ سوت کے تانے کے پاٹ ہوتے تھے۔ اس کی پہلی منزل یہ ہوتی تھی کہ عام طور پر رستے میں دو ڈنڈوں سے وہاں تک تانے ❷ کی پچھ کڑیوں کی طرف کرتے اور اس تانے کو یہاں سے وہاں تک لے جاتے اور لے

❶ ان کے اعمال بیکار گئے

❷ مرگھٹ

[کر]تے تھے۔ عام طور پر ان کی عورتیں بے پردہ رہتی تھیں۔ وہ عورتیں ننگے سر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر بے پھرتی تھیں، وہاں چلتی پھرتی رہتی تھیں۔ وہ اس کو ایک بہت ہی قابل ذکر بات سمجھتی تھیں۔ جس میں کئی دن تک جلتی ہوئی چتائیں رہتی تھیں اور وہاں چھوڑ دیا جاتا تو بے معنی ہوتا تھا۔ اس پر ہمارے ہاں پنجابی میں ایک محاورہ ہوتا تھا کہ جو اس طرح سے اِدھر اُدھر پھرتا رہے تو بہت برا ہے۔ اس کا نتیجہ پوچھنے والے کہا کرتے تھے کہ مولانا نذیر احمد نے اس کی بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ ذرا سا ٹانکا ٹوٹا تو ساری محنت بے کار چلی جاتی ہے۔ یہی ہے: وَضَلَّ سَعْيُهُمْ یعنی ان کے عمل رائیگاں چلے گئے۔

یہاں کہا کہ انسان سمجھتا یہ ہے کہ اس سے کوئی مواخذہ کرنے والا نہیں ہے، اور زندگی کے عمل کی کیفیت یہ ہے کہ جو دل میں آتا ہے کرتا ہے اور ذہن میں یہ تصور ہے کہ میں بہت اچھے کام کر رہا ہوں۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ زندگی کے اس انداز سے اس پر اس کے اعمال کا ایک محسوس نتیجہ مرتب ہوگا۔ سب کا سب اعمال نامہ ساتھ ہوں گے یعنی دنیا کے سب کے سب نتائج کے ہے یہ تمام درج ہوتے ہیں جو بتاتا اور آخر میں جو ہوا وہ لے گا تو زندگی کا مقصد پورا ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى[1] (75:36) آپ نے غور فرمایا یہ ایک لفظ میں قرآن بات کتنی بڑی کہہ جاتا ہے۔ اس لفظ "سدیٰ" کے اندر سارا دین آ جاتا ہے۔

جہنم فرد کی حقیقت

اب رہی یہ بات کہ کیا اس کے بعد پھر دوسری زندگی بھی ہوگی؟ یہ پیچھے سورۃ 75 میں بھی آ چکا ہے کہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب انسان مر جائے گا، ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، خاک میں مل جائیں گی، گوشت کو کیڑے کھا جائیں گے، یہ راکھ کے ساتھ راکھ ہو جائیں گی تو اس کے بعد انسان دوبارہ زندگی کیسے پائے گا؟ قرآن نے ایک تو یہ کہا کہ اس زندگی کے متعلق تم ذہن میں نہیں لا سکتے کہ وہ کیسی ہوگی، مگر تمہارا اعتراض بھی ہے۔ یہ امکانات میں سے ہے۔ سب انسان کے علم میں سے کوئی چیز اس طرح باقی نہ رہے تو پھر بھی اس کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ قرآن اس قسم کی ایک دلیل دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے۔ لَا يَسُوْعُهُمْ لَهٗ (7:24) اس کا تو ان کے پاس

---

❶ انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ نہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد ہے، نہ اس کے فرائض کوئی مرتب متعین، نہ اس کے رستے پر چلنے کے قواعد وضوابط ہیں۔ اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح جی میں آئے اور جس طرف جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے۔ اس تصورِ حیات کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ طبعی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کا ہی محتاج رہتا ہے اور اس میں انسانی ذات (Human Personality) کا کہیں ذکر ہی نہیں آتا۔ اس طرح اس کی ساری زندگی بے مقصد دوڑ دھوپ میں صرف ہو جاتی ہے۔ حالانکہ زندگی کی مقصد عاملہ کے کمانے اور مستقبل کے بنانے سے پیچھے کا نام ہے۔ یہی نہیں کہ زندگی عبارت ہے پیدا کرنے میں دنیا کا بنانے سے۔ آگے یہ اور دیا روح اور وہ مستقل اقدار اور موجودگی حیات کا اس طرح احترام سے حفظ انسانی زندگی کا

مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآنی تعلیم انہی کا امتزاج سکھاتی ہے اور یوں انسانی کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیتی ہے۔) (مفہوم القرآن ۔ پرویز)

نہیں ہوسکتا جب ہم دلیل دیتے ہیں۔ کہا کہ مرنے کے بعد پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا یہ کچھ ہے تو سہی' وہ مٹی میں ملا ہوا سہی' وہ کیڑوں نے ہی کھایا ہوا سہی' پھر بھی کوئی نہ کوئی وجود تو ہے ہی۔ اس کے برعکس یہ ساری کائنات جو پیدا ہوئی ہے' وہ تو عدم سے وجود میں آئی ہے' جہاں کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ یہ ساری کائنات تمہارے سامنے ہے اور تم کھڑے ہو۔ تمہارا سب سے بڑا سائنسدان بھی یہ کہتا ہے کہ ہم اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ Nothingness (عدم) سے Being (موجود) کیسے ہوگئی' کیسے عدم سے وجود میں آ گئی جبکہ کچھ نہ تھا؟ یہ بڑی صحیح بات ہے کہ یہ جو عالمِ اسباب ہے' یہ جو فزیکل کائنات ہے' اس Nature (فطرت) میں مختلف چیزیں موجود ہیں' وہ Elements (عناصر) کی شکل میں ہی سہی' وہ موجود تو ہیں۔ کوئی سائنسدان نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس طرح عدم سے وجود میں آ گئیں۔ آگے جو کچھ ہو رہا ہے وہ تخلیق ہے۔

خلق کے معنی ہوتا ہے ''مختلف چیزوں کو خاص تناسب کے ساتھ اکٹھا کر کے ایک نئی چیز بنا دینا۔'' یہ نئی چیز عدم سے وجود میں لانے کی نہیں ہے۔ جو چیزیں موجود ہیں' یا انہی میں مختلف تناسب سے' مختلف توازن سے' کچھ اختلاف پیدا کر کے ایک نئی چیز بنا دینا ہے۔ یہ سارا کچھ یہی ہے۔ یہ جتنا کچھ بھی یہ سائنسدان ہمارے ہاں کرتے ہیں' یہ جو بھی صنعت و حرفت ہوتی ہے' وہ موجود چیزوں کو ترتیب نو دے کر ایک نئی چیز بنا دینا ہے۔ یہ تخلیق ہے' یہ عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے۔

بصارت کو بصیرت میں بدل دینے والی دلیل

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ یہ کچھ تو تمہاری سمجھ میں آیا ہے۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ چیزیں جن کی ترتیب سے تم تخلیق نو کرتے ہو' یہ بذاتِ خود کہاں سے آ گئیں؟ کوئی ایسا Element (عنصر) اس سے پہلے نہیں تھا کہ جن سے یہ وجود میں آئی ہیں۔ تو جو خدا اس طرح سے اتنی عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے' کیا وہ ایک انسان کو ازسرِ نو پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر دلیل کی رو سے سمجھنا چاہتے ہو تو یہ کتنی محکم دلیل ہے۔ اب اس کے بعد اگلی آیت میں کہا کہ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى (75:37) [1]۔ اپنی پیدائش پہ غور کیجیے۔ انسان یا انسانی بچہ یا جو کچھ بھی یہ انسان اب ہے' کیا یہ تمہارے ذہن میں آ سکتا تھا کہ یہ ایک ابتدائی مادہ تولید سے یہ کچھ بن جائے گا؟ یہ Scientist (سائنسدان) یا ڈاکٹر وغیرہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا مادہ تولید سے ہوئی۔ اس ایک قطرے میں کروڑوں جرثومے ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے اتنے بچے بن سکتے ہیں۔ یہ جرثومے کیسے پیدا ہوتے ہیں' غور طلب ہے۔ تخلیق انسانی کی ابتداء (Conception) میں' جس سے یہ تخلیق آگے چلتی ہے' دو جرثومے [2] اکٹھے ہوتے ہیں: نر کا تولیدی جرثومہ' مادہ کا (تولیدی جرثومہ:

---

[1] اسے سوچنا چاہیے کہ حیاتِ انسانی' کتنے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔ وہ ایک قطرۂ آب تھا جو رحم میں گرا دیا گیا۔ (مفہوم القرآن ۔ پرویز)

❷ Sperm (نر کا تولیدی مادہ) اور Ovum (عورت کا مادہ تولیدی)

بیضہ خلیہ) یعنی عورت کا اور مرد کا (تولیدی Reproductive) تخم مِثل اکٹھے ہوتے ہیں تو تخلیق انسانی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تخم مِثل کہاں سے آئے؟ پھر کہا کہ یہ کہیں سے بھی آئے' کیا اس کا کوئی تخم مِثل مائیکرو اسکوپ (خوردبین: Microscope) کے بغیر اندر سے نظر آتا ہے؟ وہ تو ایسا ہوتا ہی نہیں ہے جو آنکھ سے دیکھا جاسکے۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ ہوتا کیا ہے؟ وہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک چھوٹا سا انسان ہوتا ہے' وہاں وہ بونا سا ہوتا ہے' بالکل نہیں۔ اُسے تو سوئی کی نوک کے جتنا ایک ذرا سا نقطہ سمجھ لیجیے۔ وہ بس یہ ہوتا ہے۔ کہا کہ اگر اس اکیلے کو دکھا کر کسی سے کہا جائے کہ اس کے اندر تمہارا باپ چھپا بیٹھا تھا تو اس بات کو کوئی نہیں مانے گا حالانکہ وہ اسی کے اندر تھا۔ ہر بیج کے اندر تناور درخت ہوتا ہے۔ ہر اس تخم مِثل تناسل کے اندر انسان کا بچہ بیٹھا ہوتا ہے' پورا انسان ہوتا ہے۔ کہا کہ وہاں سے تو یہ بات شروع ہوئی کہ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً (75:38) پھر وہ ذرا لوتھڑا سا' چپکنے والا' کچھ بن گیا۔ قرآن نے دیگر مقامات میں انسانی بچے کی رحم کے اندر جو Stages (مراحل) ہیں' انہیں بھی گنایا ہے اور اسی لیے گنایا ہے کہ ذرا دیکھتے چلے جاؤ۔ کیا تم تصور میں لاسکتے ہو کہ اس سے یہ کچھ بن جائے گا؟ یہ کچھ وہاں ہوگا؟ اب اس نے وہ ذرا سی محسوس شکل اختیار کی ہے۔ اس کے لیے کہا کہ فَخَلَقَ (75:38)۔ اب یہاں لفظ خلق آیا۔ خلق کے آگے فَسَوّٰى ❶ (75:38) آیا۔ اب اس میں تناسب پیدا ہوا۔ وہ گوشت کا ایک لوتھڑا سا ہی ہوتا ہے۔ اب اس کے اندر یہ سارا تناسب ہے: سر ہے' آنکھیں ہیں' یہ بازو ہیں' یہ ٹانگیں ہیں' یہ انگلیاں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ عزیزانِ من! "تسویٰ" کہتے ہیں: حشو و زوائد کو' فالتو چیزوں کو' اِدھر اُدھر چھانٹ کر' الگ کرکے' اس میں سے ایک مجسمہ کھڑا کرنا۔ یاد رکھیے! خدا کی ایک صفت المُصَوِّر بھی ہے۔ یہ صفت کے مطابق ایک مجسمہ کھڑا کرتا ہے۔

کمہار کے عمل کی مثال

عزیزانِ من! اس کی ایک مثال کمہار کے عمل کی ہے۔ وہ کمہار اپنے اس پہیے کے اوپر مٹی کا اتنا بڑا تودا سا لوتھڑا سا ڈالتا ہے۔ اس پہیے کو گھماتا ہے تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ جتنی زائد مٹی ہوتی ہے' اُسے الگ کرکے ایک نئی چیز بنالیتا ہے۔ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا۔ یہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ وہ کمہار بڑا ہنرمند ہوتا ہے۔ اس کے یہی دو ہاتھ ہوتے ہیں۔ اس کے پاس ایک تاگا ہوتا ہے' تھوڑا سا پانی ہوتا ہے۔ وہ اس کو کچھ یوں کرتا چلا جاتا ہے اور مٹی کو اِدھر اُدھر الگ کرتا چلا جاتا ہے' اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے آبخورہ بن گیا' صراحی بن گئی' کسی کا یہ بن گیا اور کسی کا وہ۔ یہ المُصَوِّر ہے۔ یہ جو حشو و زوائد کو الگ کرکے' صحیح تناسب سے' ایک چیز کو پیدا کردینے کا عمل ہے' تسویہ کہلاتا ہے۔ یہاں قرآن "فسوّیٰ" کہتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ پھر یہ کچھ بھی ہوتا ہے۔ تم میں سے کوئی یہ کچھ نہیں کررہا ہوتا' نہ اس بچے کا باپ کررہا ہوتا ہے' نہ اس بچے کی ماں کررہی ہوتی ہے' نہ وہاں کوئی مشینری لگی ہوئی ہے جو یہ کچھ کررہی ہے' نہ وہاں خراد لگا ہوا ہے جو

---

❶ بعد ازاں اس میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا ہوا۔

یہ کچھ کرے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کیسے ہو رہا ہے؟ یہ قانونِ خداوندی ہے جس کی رو سے یہ ہو رہا ہے اور پھر اگلی ہی آیت میں کہا کہ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ❶ (76:39)۔ وہ ایک ہی قسم کا نہیں پیدا ہو جاتا۔ پھر اس میں نر اور مادے کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ دونوں کے طبعی وظائف ہوتے ہیں یعنی یہ جو دونوں کے جسم کے وظائف اور چیزیں ہوتی ہیں وہ اسی جرثومے سے کچھ الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ کہا کہ صرف اتنی سی چیز پہ ہی غور کرو۔ اس کے بعد کہا کہ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ (76:40) کیا یہ کچھ کر لینے والا جو خدا کا قانون ہے' وہ اس پہ قادر نہیں ہے کہ وہ انسان کو پھر زندہ کر دے؟ کیا بات ہے کہ سمجھانے کے لیے دلیل کیا کیا دی ہے! بات تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' زندگی آگے چلتی ہے۔ آگے جو زندگی ہے' اس کا دارومدار ان اعمال پہ ہے جو انسان اس دنیا میں کرتا ہے۔ یہ ارتقائی منزل میں آگے بڑھنا ہے یا وہیں رک کر کھڑے ہو جانا ہے۔ اس رک کر کھڑے ہو جانے کو جہنم یا جحیم کہا جاتا ہے۔ اس تصورِ حیات کے لیے راستے میں یہی چیز مانع تھی جو یہ کہتے تھے کہ نہیں صاحب! ہم انسان کو دبا دیتے ہیں' اس کو مٹی کھا جاتی ہے' جلا دیتے ہیں' پانی میں گرتا ہے' مچھلیاں کھا جاتی ہیں تو اس کے بعد کس طرح سے کوئی چیز وجود میں آ سکتی ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ یہ ختم ہو گیا۔

کوئی مادہ ❷ ختم نہیں ہوتا

قرآن یہی سمجھاتا ہے کہ تم خود اپنے سائنسدانوں سے پوچھو کہ کیا یہ چیز ختم ہو جاتی ہے؟ سائنسدان تو یہ کہتے ہیں کہ جو Matter (مادہ) ہے' یہ کبھی ختم ہوتا ہی نہیں۔ ''ختم نہیں ہوتا'' کے معنی ہیں کہ اس کا عدم نہیں ہوتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس کی Existence (وجود) ختم ہو جائے۔ وہ شکلیں بدلتا ہے' وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شکلیں ہی بدلتا ہے۔ تو کیا جس نے ایک جرثومے کی شکل بدل کر' ایک تندرست و توانا بچے کی ہیئت میں پیدا کیا' پھر وہ انسان اتنا بڑا بن گیا' کیا اس طرح شکلیں بدلنے والا خدا کا قانون یہ نہیں کر سکتا کہ جسے تم کہتے ہو انسان مر گیا' وہ انسان زندہ ہو جائے۔ اگرچہ دوسرے مقامات پہ یہ بھی کہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ اس قسم کا انسان اسی شکل کا ہوگا یا کچھ اور ہوگا۔ نہیں' کچھ نہیں' تمہارا یہ شعور ابھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس قسم کا ہوگا لیکن یہ سمجھو کہ اس کے بعد وہ زندگی ہے' وہ Individual (فرد) ہے' وہ ہر فرد کی انفرادی زندگی ہے۔ ہر فرد کو اس کا احساس ہوگا کہ میں نے پہلی زندگی بسر کی ہے' وہ اپنے اعمالنامے کو دیکھ کر پہچانے گا کہ اس میں یہ یہ کچھ اس نے کیا ہے۔

---

❶ اس میں جنسی تفریق سے مرد اور عورت کے جوڑے بنے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

سب سے بڑا جہنم

عزیزانِ من! اسے نہ بھولیے جو میں کہا کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ جہنم تو یہ ہوگا جو قرآن کہتا ہے کہ وہاں تم بھی ہوگے، جن لوگوں میں تم نے یہاں زندگی بسر کی ہوگی، کسی کو فریب دے کر بسر کی ہوگی، کسی سے منافقت برتی ہوگی، کسی سے جھوٹ بولا ہوگا، اور بڑے کاریگر معتبر بن کر وہاں سے چلے آرہے ہوگے، یہاں آؤگے تو یہ ساری چیزیں بے نقاب ہونگی، اور وہ سارے تمہارے سامنے کھڑے ہونگے۔ اف! جن کے سامنے یہاں آدمی معتبر بننے کی کوشش کرتا ہے، ایک جگہ جھوٹ بول کے کہ کہیں میرا یہ جھوٹ بے نقاب نہ ہوجائے، کسی طرح بات نہ کھل جائے، یہاں یہ کیفیت ہے کہ سب کچھ سامنے ہوگا۔ وہاں صورت یہ ہوگی کہ تم ہوگے اور یہ سب ہونگے اور یہ سب کچھ جو لکھا ہوا ان کے سامنے آئے گا کہ دل میں اس کے یہ تھا، کہ تمہیں یہ دیا تھا۔ وہ پوچھیں گے کہ کیوں حضرت صاحب! وہاں تو بڑے مقدس اور معتبر بنے بیٹھے تھے، اور حالت آپ کی یہ تھی۔ اور پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ کسی قسم کی کوئی بہانہ سازی اور عذر وہاں کام نہیں دے سکے گا، حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔ سب سے بڑا جہنم تو وہ ہے، عزیزانِ من! تو یہ ہے قرآن کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ کہ تمہارا ہر عمل، ہر کام، ہر آرزو اور ہر ارادہ تک اپنا نتیجہ، محسوس نتیجہ برآمد کر کے رہے گا۔ یہاں نہیں تو اگلی زندگی میں سہی اور یہ قرآن کی ساری تعلیم کا ملخص ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ القیٰمۃ، آج اس آیت پر ختم ہوگئی۔ آئندہ ہم سورۃ الدھر لیں گے۔ یہ 76 ویں سورۃ ہے اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ سے شروع ہوتی ہے۔ کیا بات ہے کہ یہ پچھلی آیت کے تسلسل میں ہی یہ چیز آرہی ہے۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ❶ (76:1)۔ وہاں سے بات شروع ہوتی ہے کہ یہ انسان اس قابل بھی نہیں تھا کہ اس کے متعلق تم کوئی لفظ بھی استعمال کرسکو۔ تمہارے پاس ڈکشنری کے اندر کوئی ایسا لفظ نہیں تھا جو بتا سکو کہ اس سے پہلے یہ کیا تھا۔ جسے تم Non-existence (عدم) کہہ دیتے ہو، صرف عدم کہہ دیتے ہو، موجود نہیں ہے کہہ دیتے ہو، یہ کیا تھا؟ تم نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❁ ...... ❁ ❁ ❁ ...... ❁

---

❶ یہ حقیقت ہے کہ انسان (جو اس وقت پیکر بشریت میں موجود ہے) اس پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب یہ کوئی شے نہ تھا جو از خود موجود ہوتی۔ (پھر ہم